فضل الرحمٰن (مرحوم)

صوفی تنظیمات

تصوف اور عوامی مذہب۔صوفی سلسلہ: جس طرح تصوف کے نظریے اور روایات ابتدائی زہد و تقوی اور مبلغین کی کوششوں سے ظہور میں آئے اسی طرح عوامی مذہب کی تحریک کو عالم اسلام میں پانچویں صدی ہجری کے دوران حیرت انگیز فروغ حاصل ہوا۔ یہ تحریک صوفی مکاتب فکر کے نظریات سے براہ راست وابستہ تھی۔ صوفی ادرش کی ابتدائی صورت گری ان مرشدین کی مرہون منّت ہے جو اپنے حلقہ مریدین کا محور ہوتے تھے۔ ان حلقوں کو ان کے گوناگوں نظریات کے پیش نظر بجا طور پر صوفی مکاتب کہا جا سکتا ہے۔ ان کے خاص صوفی نظریات پانچویں صدی ہجری کے صوفی بزرگ شیخ علی ہجویری کی کشف المحجوب میں محفوظ ہیں۔(جن کا مزار لاہور میں مرجع خلائق ہے۔)

تیسری صدی ہجری کے وسط میں تصوف کی تربیت بغداد اور دوسری جگہوں میں عام ہوئی۔ عوام میں اس کی بے پناہ مقبولیت کی توجیہ مذہبی' سماجی اور سیاسی عوامل کے حوالہ سے ہو سکتی ہے۔ اول تو تصوف نے یہ دعوی کیا کہ صوفیانہ تربیت کے بعد کوئی بھی وصل الٰہی سے سرفراز ہو سکتا ہے۔ راسخ العقیدہ علماء نے اس موقف کو مسترد کیا۔ اس آدرش میں اس بلا کی دلکشی تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ تصوف نے مذہب کے اندر ایک مذہب کی حیثیت اختیار کر لی جس کے افکار' طرز عمل اور تنظیمات تمام تر اپنی تھیں۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے تصوف نے ایک صاف ستھرا طریقہ اختیار کیا جو ایک نو وارد جویائے حق کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ علائق بشری سے پاک ہو کر "الوہی حیثیت" اختیار کر لیتا ہے۔ اپنے بلند نصب العین اور اوامر اخلاقی کے باوجود اس تحریک کے عوامی رہنما رفتہ رفتہ "وصل الٰہی" کے لیے

صوفی طریقت میں مضمر اخلاقی برائیوں سے صرف نظر کرنے لگے۔ لیکن تصوف کی ترغیب مزاحمت پذیر ثابت ہوئی اور علماء کی آواز بے آواز ہو کر رہ گئی۔ بالآخر آٹھویں صدی ہجری میں راسخ العقیدہ "مذہب" نے ہتھیار ڈال دیئے۔

لیکن تصوف کی اشاعت میں مذہبی تحریک ہی واحد عامل نہیں تھا۔ اس کے سیاسی' سماجی ملحوظات اور احتجاجی نہج مذہبی تحریک کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور ثابت ہوئی۔ تصوف نے اپنے رسومات اور محافل کشف کے ذریعہ سماجی زندگی کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جس نے جہلا کی سماجی ضرورت پوری کر دی۔ اس سے شہری دنیا سے جدا اور تہذیبی زندگی سے عاری قصباتی سلسلوں کی مقبولیت کی توجیہ ہوتی ہے۔ یہ بات ان صوفی سلسلوں پر زیادہ صادق آتی ہے جو موسیقی اور رقص و سرود میں ڈوبے رہتے ہیں۔ تصوف ان سماجی مذہبی رسوم کے ذریعہ پیشہ ور گروہوں سے منسلک ہوا۔ قرون وسطیٰ کا ترکی اس کی واضح مثال ہے' جہاں صوفی تحریک کا پیشہ ورانہ انجمنوں اور عسکری رسالوں سے گہرا رابطہ تھا۔ تمام اہل حرفہ کسی نہ کسی درویش سے وابستہ تھے۔ اور انہیں ان کی روحانی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ "گلڈز" (اخوانیت) اس لحاظ سے قرون وسطیٰ میں یورپ کے گلڈز سے مشابہ تھیں۔ مزید براں یہ صوفی تنظیمیں ریاست کے اقتدار کے سامنے فصیل کی حیثیت رکھتی تھیں۔ خاص کر گیارہویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام کی سیاسی وحدت پارہ پارہ ہونے لگی۔ اور بے سہارا عوام ان جابر سلاطین کے رحم و کرم پر رہ گئے' جن کی حاکمیّت کو علماء نے فساد فی الارض کے مقابلہ میں کمتر برائی کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ اس طرح تصوف نے اپنی منظم شکل میں سیاسی استبداد کے خلاف احتجاج کا وظیفہ بھی ادا کیا۔ قرون وسطیٰ کے ترکی اور عصر حاضر کے شمالی اور مغربی افریقہ اور مشرقی سوڈان پر یہ بات صادق آتی ہے۔ ترکی میں صوفی تحریکیں تیرھویں صدی سے ریاست کے خلاف بغاوتوں سے منسلک رہیں۔ (جب بابا الیاس نے آخری سلجوقی سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا)۔ یہ بات آگے چل کر واضح ہو گی کہ افریقہ میں مختلف صوفی سلسلوں نے یورپ کی استعماری قوتوں کی مدافعت کی سخت عسکری مزاحمت کی ہے۔

یہ کہنا بھی درست نہیں ہو گا کہ صوفیا نے محض مذہبی بنیادوں پر علماء کی مخالفت کی۔ علماء ایک طبقہ کی حیثیت سے ریاست کے گہرے حلیف رہے ہیں۔ شرعی قوانین جن کا نفاذ ریاست کی ذمہ داری تھی' علماء کا وضع کردہ تھا۔ علماء سرکاری ملازم بھی تھے۔ کیونکہ ان قوانین کا اطلاق ان کے سپرد تھا۔ لہٰذا عوام الناس کے نزدیک علماء اور وہ اسلام جس کا وہ دفاع کرتے تھے' دونوں ہی ریاست کے حلیف تھے۔ خاص کر قرون وسطیٰ کے اواخر میں عوامی تصوف کا معاندانہ رویہ' اس صورت حال کا نتیجہ تھا۔ اس میں محض اس امیرانہ ٹھاٹھ کو دخل نہیں تھا جسے عوام نے راسخ العقیدہ نظام تعلیم اور اداروں کی عقلیت اور علیحدگی پسندی کی وجہ سے ان سے منسوب کر رکھا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عوامی ناپسندیدگی نے اس میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

دوسری صدی ہجری میں قرآن کی بہ آواز بلند اجتماعی تلاوت یا ذکر کا غیر رسمی آغاز ہوا۔ جس نے آنے والی صدیوں میں باضابطہ رسم کی حیثیت اختیار کر لی۔ افریقہ کے صوفی سلسلوں میں ورد کی اصطلاح نے ذکر کی جگہ لے لی۔ اس طرح "ذکر" یا "ورد" اب تلاوت قرآن کی بجائے ۹۹ اسمائے الٰہی کا ورد تسبیح سے عبارت ہو گیا۔ روشناسی کی تقریب جو اصلاً غیر اسلامی ہے اور بعض صورتوں میں عیسائیت سے مستعار ہے' متعارف ہو گئی۔ تاہم اسے ایک اسلامی ہیئت دے دی گئی۔ یہ روشناسی یا بیعت کی رسم کا ایک مختصر خاکہ ہے جو خلوتیہ سلسلہ کے ایک شیخ کے ہاتھوں ادا کی گئی:

طالب مرشد کے سامنے دو زانو بیٹھ جاتا ہے۔ مرشد جنوب کی طرف رخ کر کے سورہ فاتحہ کی تلاوت کرتا ہے اور اپنا ہاتھ طالب کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے' جو اپنی روح مرشد کے حوالہ کرتا ہے۔ مرشد طالب سے تین بار کہتا ہے کہ میرے ساتھ کہو: میں خدائے بزرگ و برتر سے توبہ کرتا ہوں' اور اس کے بعد قرآن کی دو آخری سورتوں کی تلاوت کرتا ہے۔ اور اس کے بعد قرآن سے ایفائے عہد کی آیت کی تلاوت کرتا ہے: (جو تجھ سے (محمد ﷺ) وفاداری نبھاتے ہیں' اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے ہیں)' اس کے بعد مرشد طالب کے لیے دعا کرتا ہے۔ اسے اللہ کو سونپتا

ہے۔ اپنے عہد کی ذمہ داریاں نبھانے اور صراط مستقیم پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔)[۱]

صوفیانہ واردات کو بروئے کار لانے کے لیے صوفیانہ طرز عمل میں فی زمانہ بہت سی غیر ضروری باتیں شامل ہو گئی ہیں۔ عامیانہ مذہبی تصورات اور طرز عمل سے سمجھوتہ کر کے تصوف اب اس کا شکار ہو گیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری کے اواخر اور آٹھویں صدی کے اوائل تک تصوف اس انتہا کو پہنچ چکا تھا جہاں سے واپسی ممکن نہیں تھی۔ تصوف میں جو چیزیں در آئیں ان میں موسیقی، رقص اور بے ہنگم حرکات نمایاں ہیں۔ موسیقی کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اسے سلسلہ قادریہ کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی کے خلیفہ شمس الدین نے تصوف میں متعارف کرایا۔ ایک اور سلسلہ رفاعیہ ان خرافات میں اس بری طرح مبتلا تھا کہ انہیں ''غوغائی درویش'' کہا جانے لگا۔ جب یہ ایک حلقہ بنا کر الا پتے ہیں تو ان کے ہاتھ اپنے ساتھی کے کاندھوں پر ہوتا ہیں اور اپنے اوپر کے دھڑ کو آگے پیچھے جھکاتے ہیں۔ اس حالت وجد میں سانپ اور چاقو جیسی اشیاء پر گرتے ہیں جو وہاں رکھ دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک سلسلہ جباویہ ہے (جو آٹھویں صدی میں ظہور پذیر ہوا۔) جس کے پیرو داہنی ایڑھی پر آنکھیں بند کر کے اور ہاتھ پھیلا کر رقص کرتے تھے۔ انہیں ''گردشی درویش'' کہا جاتا تھا۔ بعض دوسرے انتہا پسند سلسلوں میں کپڑے پھاڑنے اور شیشہ خوری کی روایت بھی تھی۔ (یہ وہ شمالی روایات تھیں جو منگول حملوں کے ساتھ در آئیں تھیں)۔

تصوف نے اپنا نصب العین نہیں بدلا تاہم عوامی مذہب سے اس میں بنیادی تبدیلی آ گئی۔ اسلامی معاشرہ عملاً قلب ماہیت کا شکار ہو گیا۔ روحانی ترفع اور تزکیہ نفس کی بجائے تصوف تنویمی بے خودی اور رویا کے حوالہ سے ایک طرح کی روحانی بازی گری بن گیا اور نظریاتی سطح پر یہ کم و بیش ھذیانی عرفانیات میں بدل گیا۔ نظریہ اور عمل میں بہرحال تعامل برقرار رہا۔ پانچویں صدی ہجری میں اولیاء کرام کی کرامات کا شہرہ ہوا اور راسخ العقیدگی نے اسے محتاط انداز میں تسلیم کر لیا۔ فلاسفہ میں الفارابی کی فکر جس کا تعلق چوتھی صدی ہجری سے ہے۔ معجزات سے آزاد ہے۔ لیکن

ایک صدی بعد ہی ابن سینا کو ایک ایسا عقلی نظام وضع کرنا پڑا جس میں کم از کم ایسے معجزات کی گنجائش نکل سکے، جن کی توجیہ سائنسی نفسیات کے حوالے سے ہو سکے۔ الغزالی کے افکار کے زیر اثر ایسا نظریہ وضع کیا گیا جو "عالم مثال" کا وجود ثابت کر سکے۔ جو مادی اور روحانی عالم کے درمیان ہے۔ یہ خواب و خیال کی دنیا نظری طور پر "کرامت فروشی" کے لیے ایک موزوں میدان ثابت ہوئی۔ اس صورت حال نے صوفی شیوخ کی جذباتی خطابت سے آمیز ہو کر ہر طرح کی کج روی کے لئے دروازے کھول دیئے، جس پر بہروپیا پن بھی شامل تھا۔ (اب اصحاب معرفت اور روشن ضمیر مرشدوں کی بجائے) حال مست مجذوب، بھک منگے اور لٹیرے درویش تصوف کے عہد عروج میں "دین محمدی" کے اجارہ دار بن بیٹھے اور اسلام ان (فریب خوردہ) روحانی خطاکاروں کے رحم و کرم پر رہ گیا۔

کرامات کا عقیدہ فی الواقع اولیاء کرام کی قوت کے نسبتاً وسیع تصور کا ایک حصہ تھا جو ان کے خلفاء کے ذریعہ منتقل ہوتا تھا۔ روحانی پیشوا کی ذات سے صادر ہونے والی قوت ان کے مقتدیوں کی روحانی اور مادی تقدیر دونوں ہی پر برابر اثر انداز ہوتی تھی۔ اور اسے برکت یا فیض کا نام دیا جاتا تھا۔ عقیدہ برکت کی عام مقبولیت اولیاء کرام کے مزارات و باقیات کی تعظیم و تکریم کا موجب بنی۔ ان مزاروں پر سالانہ عرس منعقد ہوتے ہیں جن کے ساتھ میلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس سے زائرین کی سماجی ضروریات پوری ہونے کی ایک راہ نکل آتی ہے۔ جو اطراف و جوانب سے یہاں جمع ہوتے ہیں، ان کراماتی درویشوں میں شیخ عبدالقادر جیلانی کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ (بے شبہ حضرت شیخ علم و معرفت میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں) لیکن جنھوں نے صوفیاء کے انتہا پسند پرستاروں کی نظر میں انہوں نے کم و بیش (نعوذباللہ) پیغمبر یا رسول کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

تصوف میں شیخ کو (جسے ہندوستان اور ایران میں پیر و مرشد اور نیگرو افریقہ میں مقدم کہا جاتا ہے) اپنے مریدوں کے روحانی اور مادی دونوں امور میں مختار کل تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہیں

فقیر، درویش مرید، اخوان یا عرف عام میں خوان یا تجانی سلسلہ میں ''اصحاب'' کہا جاتا ہے۔ یہ باضابطہ تصوف کا ایک کلیدی اصول ہے۔ تصوف میں محض اس بناء پر بے پیرا رہنے کی مثال شاذ ہی مل سکتی ہے کہ کوئی لائق تقلید مرشد میسر نہیں آیا۔ اکثریت نے ہمیشہ ایک مرشد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ خواہ زہد و تقوی کے حوالہ سے وہ حقیر ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح تصوف (تزکیۂ نفس کی بجائے) شخصیت پرستی کا مسلک بن گیا۔ عوام کے نزدیک ''بے پیرا'' ہونا ''بے دین'' ہونے کے مترادف بن گیا۔ اس رویہ کا اصل سبب غالباً یہ خوف تھا کہ رہ نمائی کے کسی معروضی حوالہ کے بغیر یہ کوئی اپنا ذاتی معیار وضع کر لے گا۔ الغزالی نے خود اس خدشہ کو محسوس کیا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہر مرید پر لازم ہے کہ وہ کوئی مرشد تلاش کرے جو اسے صراط مستقیم پر رکھے۔ کیونکہ ایمان کا راستہ مبہم ہے۔ لیکن شیطان کی بہت سی ''طے شدہ'' راہیں ہیں۔ جس شخص کا کوئی شیخ نہیں وہ شیطان کی رہ نمائی میں ان راستوں پر چل پڑے گا۔ لہٰذا مرید پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے نہج کو مضبوطی سے پکڑے رہے۔ جس طرح کوئی اندھا آدمی ساحل پر اپنے رہ نما کو مضبوطی سے تھامے رہتا ہے۔ اس پر پورا بھروسا رکھتا ہے۔ کسی معاملہ میں اس کی مخالفت نہیں کرتا اور مکمل طور پر اس کی پیروی کرتا ہے۔ اسے یہ جاننا چاہیے کہ شیخ سے اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس سے بھی اسے فائدہ پہنچائے گا۔ جو اس فائدہ سے زیادہ ہو گا جو اسے خود اپنے کار صواب سے حاصل ہو گا۔''(۲)

''تجھے اپنے شیخ کے تئیں اس طرح ہونا چاہیے جس طرح غسال کے ہاتھ میں میت'' یہ مشہور کہاوت اس نظریہ کا خلاصہ ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ باب اجتہاد بند ہونے سے اس ''عقل کش فلسفہ'' کو قدم جمانے کا موقع ملا۔ فی الواقع اس قاعدہ کی اس درجہ سختی سے پابندی نہیں کی گئی۔

اوراس کی مثالیں مفقود نہیں کہ کسی غیر معمولی لائق مرید کو بالآخر شیخ نے بطور خلیفہ تسلیم کرلیا ہو۔ یہ بھی درست ہے کہ تاریخ تصوف غیر معمولی کردار اور اخلاقی عظمت کے حامل لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ تاہم کسی انسان کے ساتھ مکمل روحانی سپردگی کے نظریہ کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ جس نے اس رویہ کو اس وقت بھی مسترد کر دیا تھا جب راسخ العقیدہ علماء نے نہایت احتیاط کے ساتھ بعض معتدل سلسلہ ہائے طریقت سے خود کو وابستہ کیا تھا۔

تصوف میں اعلیٰ ترین روحانی سطح پر قلب کا حوالہ نو مسلموں کے عام عقائد اور رسم و رواج کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے ایک باطل رجحان کی غمازی کرتا ہے۔ اس وسیع المشربی میں شروع ہی سے ان رویوں کی گوناگونی مضمر تھی جو نو مسلموں کو ورثہ میں ملی تھی۔ اور یہ افریقی نسیمت سے ہندی ہمہ روحیت تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک مخصوص صوفیانہ حدیث کے مطابق آنحضرت ﷺ کا قول ہے کہ (اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے کہ) میں وہ ہوں جو میرے بندے مجھے سمجھتے ہیں۔ اس قول کی بڑی اشاعت ہوئی اور ممتاز صوفیاء نے اس کی عجیب و غریب تعبیریں بھی کیں۔ شیخ ابن عربی کو اس میں بے شمار عرفانی مفاہیم نظر آئے۔ اور انہوں نے مذہبی اضافیت پر زور دیا۔ پیر رومی نے اپنی نظم "گلہ بان کی دعا" میں اس کا بڑا بھرپور اظہار کیا ہے۔

(۱) دید موسیٰ یک شبانی را براہ
کہ ہمی گفت ای خد وای الہ

(حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سرراہ ایک گڈریئے کو دیکھا جو اے اللہ! اے خدا! کہتے ہوئے فریاد کر رہا تھا۔)

(۲) تو کجائی تا شوم من چاکرت
چارقت دوزم کنم شانہ سرم

((اور کہہ رہا تھا کہ) تو کہاں ہے تاکہ میں تیرا خادم بن جاؤں، تیری جوتی سیا کروں اور تیرے سر میں کنگھی کیا کروں۔)

(۳) جامہ ات شویم شپشہایت کشم
شیر پیشت آورم ای محتشم

(میں تیرے کپڑے دھوؤں اور تیری جوئیں ماروں اور خدائے محتشم میں تیرے سامنے دودھ پیش کروں۔)

(۴) دستکت بوسم بمالم پایکت
وقت خواب آید بروبم جایکت

(تیرے چھوٹے چھوٹے ہاتھ چوموں اور تیرے ننھے ننھے پیر ملوں۔ اور جب سونے کا وقت آئے تو تیرے چھوٹے گھر کو صاف کروں۔)

(۵) زیں نمط بیہودہ بکفت آں شباں
گفت موسیٰ با کیست ای فلاں

(گڈریا اسی طرح کی بے ہودہ باتیں کر رہا تھا کہ حضرت موسیٰ ؑ نے کہا' اے شخص! کیا تجھے کچھ معلوم ہے کہ تو کس سے مخاطب ہے۔)

(۶) ہین چہ ژاژ است اینچہ کفرات و فشار
پنبہ اندر دھان خود فشار

(یہ کیا یاوہ گوئی ہے' یہ کیا کفر اور فضول باتیں ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اپنے منہ میں روئی ٹھونس لے (یعنی خاموشی اختیار کر)۔)

(۷) دوستی بی خرد خود دشمنیت
حق تعالیٰ زین چنیں خدمت غنیت

(نادان کی دوستی بھی دشمنی کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ تیری اس خدمت سے بے نیاز ہے۔)

(۸) جامہ را بدرید واہی کرد و تفت
سر نہاد اندر بیابانی و رفت
(گڈریئے نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور دل سے آہ گرم نکالی اور بیابان کی طرف چل دیا۔)

(۹) وحی آمد سوی موسیٰ از خدا
بندہ مارا زما کردی جدا
(اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ پر وحی نازل ہوئی کہ تو نے ہمارے بندہ کو کیوں ہم سے جدا کر دیا۔)

(۱۰) تو برائے وصل کردن آمدی
نے برای فصل کردن آمدی
(تو ملاپ کے لیے آیا تھا' نہ کہ جدائی کے لیے۔)

(۱۱) ہر کسی را سیرتی بنہادہ ایم
ہر کسی را اصطلاحی دادہ ایم
(ہم نے ہر شخص کے لیے ایک سیرت مقرر کی ہے۔ اور ہر شخص کو ایک خاص اصطلاح دی ہے۔)

(۱۲) ہندیاں را اصطلاح ہند مدح
سندیان را اصطلاح سند مدح
(ہند والوں کے لیے ہند کی اصطلاح مدح ہے اور سندھ والوں کے لیے سندھ کی اصطلاح مدح ہے۔)[۳]

نو مسلموں کے مقامی خیالات و روایات سے سمجھوتے کے غالب رجحان نے اسلام کو مختلف مذہبی اور سماجی تقاضوں میں بانٹ دیا اور وحدت و عینیت کی ان قوتوں کی مخالفت کی جس کی

راسخ العقیدہ علماء نمائندگی کرتے تھے۔ یہ یکسانیت اس وقت تک برقرار رہی جب تک اسلام پر قرنِ اولیٰ کا ٹھپہ لگا رہا۔ چھٹی صدی ہجری سے غیر عرب توجیہات کے سیلاب میں اسلام کی اصل ہیئت جسے علماء (حق) کی کوششوں نے برقرار رکھا تھا اگر معدوم نہیں ہوئی تو مغلوب ضرور ہو گئی۔ تصوف انہیں اس توجیہ جدید کا اصل محرک تھا۔ جو عرب خطوں میں شدید ردعمل کا باعث ہوا۔ لیکن بیک وقت تصوف اسی "درگذر" کے رویہ کی وجہ سے اشاعت اسلام کا سب سے بڑا ذریعہ بھی ثابت ہوا۔ ہندوستان، وسط ایشیاء، ترکی اور افریقہ میں تصوف کے زیر اثر لاکھوں لوگوں نے بڑی تیزی کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ اور افریقہ میں یہ ابھی تک ایک تبلیغی قوت ہے۔ مزید براں تصوف کا سنی اسلام کے ساتھ ارتباط شیعیت میں تخفیف کا باعث بنا۔ صورت حال کی اس تبدیلی کا سبب وہ عقیدت مندانہ رویہ ہے جو تصوف نے حضرت علیؓ اور اہل بیت کے بارے میں قائم کر رکھا ہے۔ تصوف حضرت علیؓ کو اپنا مورث اعلیٰ قرار دیتا ہے۔ اس نے تصوف کو شیعیت کا حریف بنا دیا۔ جسے اس امر نے اپنی اصل سے محروم کر دیا۔ اور اس کا بدل قرار پا گیا۔ آٹھویں صدی سے راسخ العقیدہ اصلاح مذہب کی قوتوں نے نوواردان اسلام کو اصل مذہب سے روشناس کرانے کی سعی شروع کر دی تاکہ اسلام کو مزید مستحکم کیا جا سکے۔ (ہم نے اس مسئلے کو کسی دوسری جگہ لکھا ہے۔

صوفی سلسلے: گو صوفی سلسلوں کا آغاز چھٹی اور ساتویں صدی ہجری سے ہوا ہے۔ لیکن قرون اولیٰ میں اس تحریک کے ایک اہم خاصہ کا سراغ ملتا ہے۔ یہ روحانی سند کا شجرہ یا سلسلہ ہے، جسے اسناد سے مستعار لیا گیا ہے۔ یہ صحت حدیث کے تعین کا وہ ادارہ ہے جسے محدثین نے فروغ دیا تھا۔ چوتھی صدی ہجری میں خالدی نے اپنی صوفیانہ تعلیمات کا سلسلے حسن بصری اور صحابی رسول انس بن مالک کے واسطے سے نبی اکرم ﷺ سے قائم کیا۔ بعد کے سلسلے حسن بصری کے واسطے سے حضرت علیؓ تک جاتے ہیں۔ بعض صورتوں میں شیعہ حضرات یہ رشتہ حضرت علیؓ اور ان کے بعض واجب تعظیم ورثا سے قائم کرتے ہیں۔ یہ نسب نامہ بلاشبہ مشکوک

ہے۔ لیکن اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری سے سنی طریقت نے شیعی ائمہ کو سند تسلیم کر کے شیعیت کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ اس طرح شیعیت کو تصوف کی اشاعت سے بڑا دھچکا لگا۔ اس کے برخلاف بائیں بازو کے بعض صوفی سلسلوں کو اور خاص کر ترکی کے بکطاشیہ سلسلے کو شیعیت اور اس کی باطنیت نے بے حد متاثر کیا۔ غالباً شیعی ائمہ کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لیے نقشبندی سلسلہ نے خلیفہ اول حضرت ابوبکر اور سہروردیہ نے خلیفہ دوم حضرت عمر بن الخطاب کو اپنا مورث اعلیٰ قرار دیا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اسلامی اصطلاح طریقت اور اس کے مغربی مترادفات Order یا Fratermity ہم معنی نہیں۔ مغربی اصطلاح میں تصوف کے تنظیمی پہلو کی رعایت ملحوظ رکھی گئی' جبکہ طریقت کی اصطلاح میں تنظیم سے گہرے تعلق کا تصور مضمر نہیں ہے۔ تاہم اس سے وہ راستہ مراد ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ تک لے جاتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ طریقت کسی متوازی اخوتیت کے بغیر ممکن ہے۔ منظم تصوف کے ظہور سے قبل طریقت صوفی مکاتب فکر کے طور پر موجود تھی۔ صوفی سلسلوں کا فروغ ان ابتدائی مدارس فکر سے ہم آہنگ رہا ہے۔ اور طریقت کی اصطلاح نے اس اصل مفہوم کو برقرار رکھا جس کی رو سے طریقت نظریاتی مضمرات کے ساتھ ایک طریق عمل سے عبارت ہے جس میں رسوم اور خارجی اعمال نے اہمیت اختیار کر لی ہے۔

شیخ صوفی برادری کا محور ہوتا ہے۔ اس کی جائے قیام یا درس گاہ کو عرب میں ''زاویہ'' یا ''رباط'' ہندوایران میں ''خانقاہ'' اور ترکی میں ''تکیہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ اجتماعی روحانی تقریبات کے لیے مرکز کا وظیفہ انجام دیتے ہیں۔ اس کی رکنیت بالعموم دو طرح کی ہوتی ہے۔ باضابطہ مریدین کے علاوہ ایک کثیر تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے' جو رشد و ہدایت کے لئے گاہے گاہے حاضری دیتے رہتے ہیں۔ لیکن انہیں زندگی کے عام کاروبار کی اجازت ہوتی ہے۔ یہ دوسرا طبقہ زاویہ کی مالی اعانت کرتا ہے۔ مریدین اپنی لیاقت' خلوص' عقیدت یا عرصہ ارادت کی بنیاد پر مختلف مراتب پر فائز

رہتے ہیں۔ ہر شخص کو اس کی صلاحیت اور ضرورت کے مطابق تعلیم و تربیت دینا صوفیاء کا بنیادی اصول رہا ہے۔ جو عملی نفسیات میں بلا کی بصیرت رکھتے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ کوئی لائق مرید چند ماہ میں خرقہ و دستار کا حقدار بن جاتا ہے۔ اور بطور خلیفہ رشد و ہدایت کا وظیفہ انجام دینے لگتا ہے۔ جب کہ دوسرے مریدوں کو خانقاہ میں ایندھن اور غلہ جمع کرنے یا لنگر کی خدمات انجام دینے میں عرصہ گزر جاتا ہے۔

عالم اسلام میں صوفی سلسلوں کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ یہاں ان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں، ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض اہم سلسلوں کی امتیازی خصوصیات کا ایک خلاصہ پیش کر دیا جائے۔ ان مراکز میں وابستگی کی سختی یا نرمی یا رسومات کی تنوع کے اختلافات سے قطع نظر ان کے معتقدین کے مطمح نظر اور ان کی ہیئت اجتماعی میں قابل لحاظ اختلافات نظر آتے ہیں۔ غیر افریقی سلسلوں میں پڑھے لکھے مہذب شہری اور دہقانی سلسلوں کے مابین ایک خط فاصل کھینچا جا سکتا ہے۔ گو شہری سلسلوں میں ان کے راسخ العقیدہ اسلام اور صوفیانہ آدرش کی جانب غالب میلان کے لحاظ سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ تاہم شہری سلسلے بالعموم راسخ العقیدہ تعلیمات سے زیادہ متاثر رہتے ہیں۔ کم از کم عملی سطح پر شریعت کے پابند نظر آتے ہیں۔ شمالی مغربی اور نیگرو افریقہ کے سلسلوں میں سیاسی رویہ کی جارحیت یا امن پسندی کا اختلاف نظر آتا ہے۔

یہ سلسلے باہم اشتراک رکھتے ہیں اور خاص کر بعد کی صدیوں میں یہ ممکن نہیں رہا کہ کسی بے لچک تقسیم کو برقرار رکھا جا سکے۔ کسی شخص کے لیے مختلف سلسلوں کا رکن ہونا نہ صرف یہ کہ ممکن نہیں بلکہ ایک ذیلی سلسلہ بسا اوقات اپنے بانی سلسلہ سے روحانی وراثت کا دعوی دار بھی ہوتا ہے۔ اور اس میں بانی سلسلہ کے لوگ آزادانہ شرکت کرتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں ایک ذیلی سلسلہ اپنے بانی سلسلہ سے برائے نام الحاق رکھتا ہے۔ اور اپنے لیے ایک آزاد لائحہ عمل اختیار کرتے ہیں۔ جس میں بانی سلسلہ کی بعض رسومات باقی رہتی ہیں جنہیں نئی اہمیت مل جاتی ہے۔ اور بعض اوقات یہ سلسلے ایک قطعاً مختلف حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ افریقہ میں ''تجانیہ'' اور ترکی میں

”مولویہ“ ان سلسلوں کی بعض انتہائی مثالیں ہیں جو مخصوص رکنیت کی شرط بر قرار رکھ سکے ہیں۔

سلسلہ قادریہ اپنے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام سے منسوب ہے۔ وہ بحر کیسپین کے جنوب میں واقع گیلان کے مقام پر ۴۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں انہیں پڑھنے لکھنے کے لیے بغداد بھیجا گیا' جہاں انہوں نے فلسفہ اور حنبلی فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ تصوف میں الدباش (م ۵۲۱ھ) کے مرید تھے۔ ۵۲۱ھ سے آپ نے عوام میں تبلیغ شروع کی اور ان کا حلقہ ارادت بڑھنے لگا۔ ۵۲۱ھ میں انہیں ایک مدرسہ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ جہاں بہت سے شاگرد آپ کے زور دار مواعظ کی طرف راغب ہوئے۔ اور شہر کے باہر آپ کے لیے ایک رباط تعمیر کیا گیا۔ اس طرح انہوں نے مدرسہ اور خانقاہ دونوں میں تبلیغ و تلقین کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ کی مشہور تصنیف غنیۃ الطالبین میں آپ کے مواعظ اور مسلم فرقوں کے تجزیے شامل ہیں۔ آپ کی تعلیمات کا غالب رجحان یہی ہے کہ ہوس دنیا کی حوصلہ شکنی' اور نکوکاری و انسان دوستی کی ہمت افزائی کی جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دوزخ کے دروازے بند ہو جائیں اور باب الجنۃ لوگوں کے لیے کھول دیا جائے۔ شیخ کے ہم عصر آپ کی انتہائی عزت کرتے تھے۔ آپ کی تبلیغ کے حیران کن نتائج کی ستائش کرتے تھے۔ جو بہت سے یہود و نصاریٰ کو دائرہ اسلام میں لانے اور مذہبی اجتماع کی روحانی سطح کو بلند کرنے کا باعث بنی۔ بعد کے بیانات اس سے ہم آہنگ ہیں۔ جو آپ کی ذات گرامی سے ہر قسم کی کرامات منسوب کرتے ہیں۔ آپ کی افسانوی حیثیت کو شہرت ملی۔ یہاں تک کہ بعض غیر راسخ العقیدہ بے ضابطہ سلسلوں نے جوش عقیدت میں آپ کو (نعوذ باللہ) پیغمبر کے مقام تک پہنچانے سے گریز نہیں کیا۔

اولیاء کرام سے کرامات منسوب کرنا تاریخ تصوف میں ایک دلچسپ باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ اکثر کرامات کسی مخصوص ولی یا اس کے سلسلہ کی شہرت و نام آوری کے لیے سوچی سمجھی اور اختراعی کوششوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی درست ہے کہ شیخ کے اقتدار اعلیٰ کے اصول کی عرصہ دراز تک کارفرمائی' اس کے عام مریدوں کی انفعالیت'

اشارہ گیری اور اثرپذیری میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔ زیادہ تر صورتوں میں مرید شیخ سے کرامات منسوب کرتے ہیں' جب کہ خود شیخ اس کی تردید کرتا ہے۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ موجودہ شیخ سے قبل وفات پانے والے شخص سے کرامات منسوب کرنے کا رجحان قوی تر ہوتا ہے۔ اس طرح کے انتساب پر اکثر شیخ خود اغماض برتتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے لئے کسی کرامت کا مدعی نہیں ہوتا۔ لیکن رشتہ ارادت کی بناء پر اور خوش عقیدگی کے ناطے متوفی سے یکسر نئی کرامات منسوب کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی عوامل ہیں جیسا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی کے سلسلہ میں نظر آتا ہے کہ جو لوگ انتہا درجہ کے تقویٰ' سخاوت اور اثرانگیز خطابت کے حامل ہوتے ہیں' ان سے ایسی باتیں منسوب ہو جاتی ہیں۔

یہ قرین قیاس ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی اپنے حلقہ مریدین کی تربیت کے ساتھ ساتھ ایک سلسلہ کے قیام کے خواہش مند تھے۔ سلسلہ قادریہ کے قیام اور اس کی ابتدائی تشہیر میں ان کے بیٹوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کا مرکز بغداد ہے اور اب تک حضرت شیخ کے ورثہ اس کا اہتمام و انصرام کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ مغرب میں شمالی اور نیگرو افریقہ' شمال میں ترکی اور مشرق میں برصغیر ہند و پاک تک پھیلا ہوا ہے۔ علاقائی سلسلوں کا مرکز سے الحاق ڈھیلے ڈھالے انداز کا ہوتا ہے۔ اور برصغیر ہند و پاک اس کی مالی اعانت کا بڑا ذریعہ ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ بغداد کے رہنما بالعموم اردو زبان کے استعمال پر قدرت رکھتے ہیں۔ اس صدی کے اوائل میں سلسلہ قادریہ نے احمد و بانیا کے ہاتھوں سینگال میں ایک نئے سلسلہ کی شکل اختیار کر لی۔ جس نے اسے ایک نئی جہت دے دی۔ یہ نیا سلسلہ "مریدیہ" کے نام سے موسوم ہوا۔ جو بدیسی اسلام کے ایک مخصوص افریقی ردعمل کی مثال ہے۔ اس سلسلہ نے صوم و صلوۃ جیسی بنیادی عبادات سے اہل سلسلہ کو مستثنیٰ کر دیا۔

قادریہ سلسلہ صوفی طریقت میں سب سے زیادہ امن پسند سلسلہ ہے اور خدا سرشاری (تقوی) و انسان دوستی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور یہی وہ اخلاقی تعلیم ہے جس کی مورث اعلیٰ نے تلقین

کی تھی۔ مجموعی طور پر یہ سلسلہ اسلام کے حدود میں ہے۔ اور دوسرے عامیانہ سلسلوں کی بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔ اس میں شبہ ہے کہ اس سلسلہ کے بانی نے نکو کاری اور بے تعصبی کے ایک غالب رجحان کے علاوہ نظریات و روایات کا کوئی بے لچک نظام چھوڑا تھا۔ مختلف مقامی تنظیموں میں ذکر کے مختلف طریقے ہوتے لیکن ان میں کوئی بات راسخ العقیدگی کے منافی نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ بالعموم قرآنی عبارتوں سے مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً "استغفر اللہ العظیم" "جل جلالہ" "اللھم صلی علیٰ محمدؐ وعلیٰ آلہ واصحابہ" "لا الہ الا اللہ" پہلے تین جملے سو مرتبہ ادا کئے جاتے ہیں۔ جبکہ آخری جملہ پانچ سو مرتبہ دہرایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ "ورد" یا "حزب" جیسی لمبی دعائیں بھی ہیں۔ ایک اور سلسلہ جو زیادہ شائستہ اور کم مقبول ہے' سلسلہ سہروردیہ ہے۔ یہ عمر سہروردی کے صوفیانہ تصورات پر مبنی ہے۔ (جو فلسفی اشراق یحییٰ سہروردی سے جدا شخصیت ہے)۔ ان کا ایران میں زنجان کے مقام پر ۱۲۳۶ء میں انتقال ہوا۔ یہ سلسلہ صرف افغانستان اور برصغیر ہندو پاک میں موجود ہے۔ گو اپنی کتاب "عوارف المعارف" کے ذریعہ شیخ سہروردی نے اپنے سلسلہ طریقت سے باہر تصوف پر قابل لحاظ اثرات ڈالے ہیں۔ اس میں آپ کا طریقہ ذکر بطور خاص قابل توجہ ہے۔ جس میں اسماء الٰہی کو ان درجات نور کے حوالہ سے مرتب کیا گیا ہے' جو "لطایف سبعہ" کے مطابق ہے۔ اس ذکر کے الفاظ قرآن سے ماخوذ ہیں۔

تیرھویں صدی ہجری میں سنوسیہ سلسلہ کے بانی نے "ساٹھ ہزار روشنیوں" کا نظریہ اس سے اخذ کیا ہے۔ سہروردیہ سلسلہ کو غالباً اپنی سخت روحانی تربیت کی وجہ سے مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن آٹھویں صدی کے اواخر میں اس نے خلوتیہ سلسلہ کو متاثر کیا۔ جو ایک اہم راسخ العقیدہ سلسلہ تھا اور جسے ایران میں عمر الخلوتی (وفات ۸۰۰ھ) نے قائم کیا تھا۔ یہ سلسلہ اپنی سخت تربیت کی شہرت رکھتا تھا۔ اسے بارھویں صدی ہجری میں ترکی میں اشاعت ملی اور مصر و مشرق وسطیٰ میں روشناس ہوا۔ اس صدی کے آخری خلوتی سلسلہ کے ایک مرید نے شمال افریقہ میں تجانیہ کے نام سے ایک نئے سلسلہ کی بنیا دڈالی۔ خلوتی سلسلہ کی بھی کئی شاخیں ہوگئیں۔ اور اس

نے راسخ العقیدہ علماء کو بطور خاص اپنی طرف راغب کیا۔

شیخ عبدالقادر گیلانی کے ایک ہم عصر شیخ احمد الرفاعی (م ۵۷۸ھ) نے ایک دوسرے اہم سلسلہ کی بنیاد ڈالی۔ اس باب کے پہلے حصے میں ہم نے اس سلسلہ کے حوالہ سے "ذکر" کی بعض غیر اعتدال پسند صورتوں اور دوسری رسومات کا تذکرہ کیا تھا۔ اس صوفی سلسلہ کو مصر، ترکی اور جنوبی مشرقی افریقہ کے بعض علاقوں میں اشاعت ملی۔ سلطان عبدالحمید کے عہد حکومت میں ابوالھدی نے جو استنبول میں رفاعیہ سلسلہ کا شیخ تھا، اسے مستحکم کیا۔ اور سلطان کے پین اسلامک پروپیگنڈہ کی حمایت کی۔ Depont اور Coppolani نے Les conferies Religieuses Musulmanes میں الرفاعی کو شیخ عبدالقادر جیلانی کا مرید اور بھتیجا قرار دیا۔ اور اس سلسلہ کو سلسلہ قادریہ کی ایک فرع قرار دیا ہے۔[۴] اس کی کوئی مستند شہادت موجود نہیں کہ ان دونوں بزرگوں میں کوئی خونی رشتہ تھا۔ لیکن یہ حکایت اس وقت عام ہوگئی جب دونوں اولیاء کرام کو عراق میں تعظیم دی جانے لگی۔ الرفاعی پر قادریہ سلسلہ کے اثرات کا سراغ نہیں ملتا کیونکہ سلسلہ قادریہ کے ظہور سے قبل الرفاعی وفات پا چکے تھے۔

صوفیاء کرام کی اپنی دنیا میں ایسی افسانوی باتوں کو بڑا سازگار ماحول مل جاتا ہے۔ اور پیرو مرید کے رشتے ابہام کا شکار رہتے ہیں۔ کیونکہ مرید و مرشد کا تعلق تاریخ کے بجائے وارداتی ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے من گھڑت نسب نامہ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ احمدیہ یا بذیہ سلسلہ کے بانی شیخ احمد البدوی (م ۱۲۷۵ء) کا بھی یہی معاملہ ہے۔ جنہیں صدیوں تک مصر میں ایک قابل احترام ولی کی حیثیت حاصل رہی۔ انہیں عالم رویا میں عراق جانے کا حکم ملا، جہاں انہوں نے ۶۳۳ھ میں مختلف صوفیاء کرام کے مزاروں کی زیارت کی جن میں الرفاعی اور الگیلانی شامل ہیں۔ اور واپسی پر مصر میں اپنے سلسلہ کی بنیاد رکھی۔ یہ مصر میں ابھی تک سب سے زیادہ مقبول "قصباتی" و "دہقانی" سلسلہ ہے۔ شیخ البدوی عجیب و غریب حرکات و سکنات میں گم رہتے تھے۔ جیسے اپنے آپ میں گم رہنا، طویل عرصہ تک لوگوں سے بات نہ کرنا۔ ساتویں صدی میں مصر میں سینٹ

لوئی یازدہم کے حملہ کے دوران انہوں نے صلیبی حملہ آوروں کے خلاف عوامی مزاحمت کو ابھارنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ قیدیوں کے آزاد کرانے کو عوام نے عظیم کارنامہ قرار دیا۔ طریقہ بدویہ نے اپنے عملیات میں قبل اسلام مصری مذاہب کے بعض عناصر کو بھی شامل کرلیا۔ ذیلی مصر کے دو مقبول سلسلہ "دسوقیہ" اور "بایومیہ" اس سلسلہ کی شاخیں ہیں۔

یہی بات سعد الدین (وفات ۷۰۰ھ) پر بھی صادق آتی ہے جسے دمشق میں سعدیہ (یا جبادیہ) سلسلہ کا بانی مانا جاتا ہے۔ اور جو بڑی پراسرار شخصیت کے مالک تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سلسلہ سعد الدین کی زندگی میں بھی مصر اور ترکی تک پھیل گیا تھا۔ اس سلسلہ اور اس کی روایات کا اشارتاً پہلے بھی ذکر آچکا ہے۔ جسے W.Lane نے اپنی کتاب "Manners and customs of the modern Egyptians" میں بیان کیا ہے۔

شمالی مغربی افریقہ میں بربر اور نیگرو افریقہ میں سیاسی رنگ آمیزی کے ساتھ اسلام کا نفوذ ہوا اور اس میں تصوف کا گہرا اشتراک رہا ہے۔ چھٹی صدی ہجری میں موحدین کی سلطنت مہدی ابن تومرت کی سربراہی میں مرابطین کی جانشین بنی۔ جس نے پانچویں صدی ہجری میں احیائے اسلام کے لیے جہاد کا آغاز کیا۔ ابن تومرت نے اشاعرہ کے راسخ العقیدہ کلام کو تصوف سے ہم آہنگ کیا۔ افریقہ میں تصوف کے لیے شیخ ابو مدین (چھٹی صدی ہجری) شعاع نور ثابت ہوا۔ معروف وحدت الوجودی شیخ ابن عربی کا پہلے حوالہ آچکا ہے۔ یہ ابو مدین کے مرید تھے، جس کے نظریات میں دنیا کو پس پشت ڈال کر ذات باری تعالیٰ پر توجہ مرکوز کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ شاذلیہ سلسلہ شیخ ابوالحسن شاذلی سے منسوب ہے جو بومدین کے مرید کے مرید تھے۔

ایسا لگتا ہے کہ الشاذلی نے کوئی مخصوص صوفی طریقت وضع نہیں کی، صرف ایک صوفی سلسلہ قائم کرلیا۔ ان کی تعلیمات کا جھکاؤ عموماً راسخ العقیدگی کی طرف تھا۔ (وہ الغزالی کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیتے تھے) جس میں اللہ کے لیے جذبہ عقیدت پر زور دیا جاتا ہے۔ الشاذلی نے رہبانیت کی حوصلہ شکنی کی ہے اور اپنے مقلدین کو ترک دنیا سے منع کیا ہے۔ ان کی تعلیمات پانچ

نکات پر مشتمل ہیں۔

(۱) خلوت و جلوت میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔

(۲) سنت نبوی ؐ کا قولاً و فعلاً اتباع کرنا۔

(۳) بنی نوع انسان کی خوش بختی اور بد بختی کو حقارت آمیز سمجھنا۔

(۴) ہر بڑے اور چھوٹے معاملہ میں رضائے الٰہی پر شاکر رہنا۔

(۵) غم اور خوشی دونوں حالتوں میں اللہ سے رجوع کرنا۔

گو الشاذلی نے کوئی تحریر نہیں چھوڑی لیکن اس کے مرید شیخ ابن عطا اللہ السکندری (م ۷۰۹ھ) نے جو امام ابن تیمیہ کے سخت مخالف تھے 'الحکم کے نام سے حکیمانہ اقوال جمع کئے تھے۔ ان اقوال پر شیخ المروندی نے حاشیہ لکھا۔ اور یہ اس سلسلہ کی بنیادی کتاب بن گئی۔ جس کی جنوب مشرقی ایشیا میں بھی اشاعت ہوئی۔ شاذلیہ اور قادریہ سلسلہ کے اشتراک سے بہت سی شاخیں ہو گئیں۔ نویں صدی ہجری میں اصلاح یافتہ شاذلی سلسلہ مراکش میں معرض وجود میں آیا جسے الجزولیہ کا نام دیا گیا۔ اساویہ آخر الذکر سلسلہ کی ایک شاخ ہے جس میں "تیغ زنی" کی رسم ہے۔ اس کے علاوہ مراکش کا راسخ العقیدہ درقاویہ سلسلہ ہے۔ شاذلیہ کو مشرقی سوڈان میں پذیرائی ہوئی تاہم مغربی افریقہ کے ممالک میں اس کا اثر کم نظر آتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک نسبتاً جدید مخصوص افریقی سلسلہ ہے' جسے تجانیہ کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ ایک سابق خلوتی مرید احمد الشعبانی نے فیض میں قائم کیا تھا۔ اس سلسلہ میں رسوم کی سادگی اور حسن نیت و اعمال خیر پر زور دیا گیا۔ اور یہی کچھ اس کی مقبولیت کا موجب اور بسا اوقات اسے ایک زیادہ جارحانہ رویہ بخشنے کا باعث بنا۔ یہ دنیاوی اور روحانی امور میں علیحدگی روا نہیں رکھتا۔ اس کے الجزائر میں فرانسیسی نوآبادیاتی انتظامیہ سے اچھے تعلقات تھے۔ لیکن اس نے مراکش میں بیرونی تسلط کی عملی مزاحمت کی۔ مراکش سے یہ سلسلہ تیرھویں صدی ہجری میں فرانسی مغربی افریقہ میں پھیلا۔ اور محمد بن مختار نے اس کی اشاعت کی۔ اس سلسلہ کو فرانسیسی گانا میں الحاج عمر

شال نے متعارف کرایا۔ تبلیغ کی یہ مہم بطور خاص لامذہبوں کے خلاف تھی۔ لیکن اس کا رخ قادریہ سلسلہ کی طرف بھی تھا۔ موجودہ صدی میں شیخ حمہ اللہ نے سلسلہ تجانیہ کو منظم کرنے کی کوشش کی جس میں انفرادی آزادی اور دیگر راسخ العقیدہ عوامل سے عبادات میں تخفیف اور تبدیلیء قبلہ جیسے امور کو بنیاد بنایا گیا۔ حمہ اللہ کو فرانسیسی انتظامیہ نے گرفتار کرلیا اور وہ جلاوطنی میں ہی وفات پا گئے (۱۹۴۳ء)۔

افریقہ میں عوامی تصوف کے ذریعہ بربر اور افریقی نسمیاتی عقائد اور رسومات نے اسلام پر اپنی چھاپ لگا دی۔ بربر کے مرابط اور نیگرو مسلمانوں کے "الفا" درحقیقت قبل اسلام افریقی "ایشیا پرستی" کی یادگار ہیں۔ وسط ایشیا میں اسلام کی اشاعت نے اسے شامانیت کے نسمیاتی مسلک کے قریب کر دیا۔ وسط ایشیا میں ابتدائی صوفی برادریاں جو ایک طرف ترکی اور دوسری جانب جنوب و مشرقی ایشیا میں پھیلیں، ان کے آغاز کی تاریخ غیرواضح ہے۔ احمد یسوی (م ۵۶۲ھ) جو یوسف الہمدانی کے مرید تھے۔ اس ایرانی و وسط ایشیائی کے حلقہ صوفیاء سے منسلک تھے جسے خولجگان کہا جاتا ہے۔ یسوی نے سب سے قدیم ترکی صوفی سلسلہ یساویہ کی بنیاد ڈالی۔ اس سلسلہ کی صورت گری مغربی ترکستان کی فضا میں ہوئی۔ جس میں شمانیت مضمر تھی۔ اور یہی خصوصیات اس کی اس شاخ میں منتقل ہو گئیں جسے بکطاشی سلسلہ کہا جاتا ہے۔ بابا بکطاش اس سلسلہ کے بانی تھے جن کا تعلق چھٹی صدی ہجری سے ہے۔ بکطاشی سلسلہ ترکی کا سب سے اہم عوامی دہقانی سلسلہ ہے، جو اناطولیہ میں پھیلا اور جس نے نویں صدی ہجری کے اواخر تک منظم شکل اختیار کر لی۔ یساویہ اور بکطاشی سلسلوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان کی تقریبات میں عورتیں شریک ہوتی تھیں۔ بکطاشیہ نے شمانیت کے عناصر برقرار رکھنے کے ساتھ شیعی میلانات اور بعض مسیحی عقائد اور رسومات کو بڑھوا دیا۔ جہاں تک مسیحی عقائد اور طرز عمل کا تعلق ہے وہ ان علاقوں میں رچے بسے رہے جہاں اس سلسلہ کی اشاعت ہوئی۔ اسی طرح وہ صرف بارہ اماموں پر ہی ایمان نہیں رکھتے بلکہ اللہ، محمد اور علی کی تثلیث کے بھی قائل ہیں۔ چنانچہ جہاں بھی اس سلسلہ نے کسی

اناطولیائی مسیحی جمعیت کو خود میں ضم کیا۔ ایک طرح کا مخلوط مذہب ظہور میں آ گیا۔ کسی نئے رکن کی استقبالیہ میں شراب، نان اور پنیر سے تواضع کی جاتی تھی۔ مرید اپنے مرشد کے حضور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا تھا، جو ان کیر اءت کرتا تھا۔ باضابطہ صوفی سلسلوں میں بکطاشیہ راسخ العقیدگی سے انتہائی برگشتہ سلسلہ ہے، اس میں اسلام کے ان احکامات کی بھی پرواہ نہیں کی جاتی جو واجب ہیں۔ عسکری دستوں سے ان کے اشتراک نے انہیں دولت عثمانیہ میں ایک سیاسی قوت بخش دی تھی اور وہ گاہے گاہے حکومت کے خلاف بغاوت کرتے رہتے تھے۔ حکومت نے اسے ۱۲۴۲ھ میں کچل دیا لیکن پچھلی صدی کے اواخر تک انہوں نے دوبارہ قوت حاصل کر لی۔ تاہم ۱۳۴۳ھ میں جدید ترکی کی ریاست نے سارے سلسلوں کے ساتھ ان پر بھی پابندی لگا دی۔ اور یہ سلسلہ اب صرف البانیہ میں باقی رہ گیا ہے۔

نقشبندیہ ایک اور صوفی سلسلہ ہے جسے وسط ایشیا، ترکی اور مشرقی مسلم ممالک میں اشاعت ملی۔ اور جس نے خواجگان سے روحانی فیض حاصل کیا۔ بہاءالدین نقش بند نے بخارا میں یہ سلسلہ آٹھویں صدی ہجری میں قائم کیا۔ نقش بند سے مصور مراد ہے۔ جس میں یہ رعایت ملحوظ ہے کہ اس سلسلہ کا بانی اپنے قلب پر روحانی نقش بناتا تھا اور آج بھی اس کے مرید ذکر کے دوران خاموش الفاظ سے اپنے قلب پر خطوط کھینچتے ہیں تاکہ صفائے قلب ہو سکے۔ نقشبند صوفی بزرگ السماسی کے مرید تھے۔ اور انہوں نے السماسی کے مرید امیر کلال کے ایک پیشرو بزرگ احمد عبدالخالق الغجوانی کا طریقہ ذکر اختیار کیا تھا۔ الغجوانی (م ۵۷۵ھ) اسی یوسف الہمدانی کا شاگرد تھا جس نے احمد یسوی کی رہ نمائی کی تھی۔ اسی بناء پر Depont اور Coppolani بکطاشیہ کو نقشبندیہ سلسلہ کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ جبکہ یہ ایک دوسرے سے آزاد سلسلے ہیں اور ان میں بکطاشیہ سلسلہ زیادہ پرانا ہے۔(۵)

نقشبندیہ ایک راسخ العقیدہ سلسلہ ہے جسے ہندوستان اور ملایا میں اشاعت ملی۔ اسے بے اعتدال ذکر، رقص اور موسیقی کی مخالفت کی وجہ سے خواص میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

ہندوستان میں اسے شیخ باقی باللہ نے دسویں صدی ہجری میں روشناس کرایا۔ لیکن ان کے اہم اور بااثر شاگرد شیخ احمد سرہندی نے اس سلسلہ کی تشکیل نو کی اور اسے مستحکم کیا۔ انہوں نے ہندوستان میں تصوف کی اصلاح و تطہیر کا بیڑا اٹھایا۔ اور ابن عربی کے وحدت الوجودی تصوف کو مسترد کر دیا۔ جسے ہندی ویدانت کی شکل میں ایک مضبوط حلیف مل گیا تھا۔

ترکی میں "مولویہ" ایک شائستہ شہری سلسلہ تھا' جسے مشہور شاعر جلال الدین رومی (م ۶۷۲ھ) نے قائم کیا تھا۔ جن کی مثنوی سے اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ مثنوی ایک فقید المثال شعری کارنامہ ہے جسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور اسے صوفیاء کے قرآن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مولویہ کی باضابطہ صوفیانہ رسومات ہیں اور یہ اپنے مخصوص رقص کے لیے مشہور رہے۔ کمال اتاترک کی انقلابی حکومت کی عائد کردہ پابندیوں کی وجہ سے یہ سلسلہ مشرق وسطیٰ میں "حلب" تک محدود ہو کر رہ گیا۔

برصغیر پاک و ہند میں قادریہ اور نقشبندیہ جیسے آفاقی سلسلوں کے علاوہ شیخ معین الدین چشتی کا قائم کردہ چشتیہ سلسلہ خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ شیخ معین الدین چشتی ۶۳۳ھ میں اجمیر کے مقام پر وفات پا گئے' جہاں ان کی درگاہ عرس کے لیے شہرت رکھتی ہے۔ مغل شہنشاہ اکبر نے اپنی ایک قسم پوری کرنے کے لیے آپ کے مزار کی پاپیادہ زیارت کی تھی۔ اکبر کا بیٹا اور ولی عہد جو بعد میں جہانگیر کے لقب سے مشہور رہا' آپ کی خانقاہ میں اس وقت کے خلیفہ سلیم چشتی کے دور میں پیدا ہوا۔ اور ان کے نام پر اس کا نام سلیم رکھا گیا۔ بہت سے مشہور خلفاء کے بعد یہ سلسلہ زوال کا شکار ہو گیا۔ لیکن کوئی ڈیڑھ سو سال قبل خواجہ نور محمد نے اس کا احیاء کیا۔

ان سلسلوں کے علاوہ برصغیر ہندو پاک بے شمار نام نہاد' بے شرع اور قابل اعتراض سلسلوں کی آماجگاہ رہا ہے' جن کی تنظیم ناقص ہے اور جو کسی داخلی نظم اور شریعت کے پابند نہیں۔ ان میں بعض باضابطہ سلسلوں کی چھوٹی شاخوں کے علاوہ کسی قدر منظم "بے شرع" سلسلے اور فقیروں اور ملنگوں کے وہ گروہ شامل ہیں جو کسی اصلی یا جعلی "پیر" کے مزار سے وابستہ ہو جاتے ہیں

اور جن کا وجود بڑی حد تک طفیلی اور ریاکارانہ ہوتا ہے۔ برصغیر میں عوامی سطح پر مسلمانوں کی مذہبی زندگی' مقامی عقائد اور رسوم و روج سے بری طرح متاثر ہے۔ اور قبل اسلام کی طرز زندگی کو بڑی حد تک باقی رکھا گیا ہے۔ تبدیلی مذہب کا عمل برائے نام رہا ہے۔ اور اسلام کے نفوذ کی رفتار تکلیف دہ حد تک سست رہی ہے۔ یہ اس امر کی غمازی ہے کہ روحانی رومانیت کے اثرات انتہائی غالب ہیں اور مقامی لوگ اب بھی ان کا شکار ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے بہت سے دیہی علاقوں میں ہندو اور مسلم مشترک اولیائے کرام کی پرستش کرتے ہیں۔ یوں تو اسلام اور ہندو مت میں مفاہمت کے آثار ورود اسلام کے وقت ہی پیدا ہونے لگے تھے۔ لیکن دسویں صدی ہجری میں کبیر اور نانک کی بھگتی تحریک سے اسے فروغ ہوا۔ نانک سکھ مذہب کے بانی تھے جو بڑی حد تک ہندو مت پر اسلامی توحید کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ انڈونیشیاء میں اسلام نسبتاً دیر سے پھیلا اور اسے مغربی استعمار سے قبل مستحکم ہونے کا کم موقع ملا۔ یہاں مسلم آبادی کی مذہبی ثقافت داخلی طور پر غیر اسلامی رہی ہے۔ جن بعض صوفی سلسلوں کو رسائی ملی' ان کی کوششوں کے باوجود قبل اسلام کے سری رویے جوں کے توں رہے۔

تسلسل: دسویں صدی ہجری سے بارہویں صدی تک کا دور مغربی ایشیا میں تصوف کا عہد عروج کہلانے کا مستحق ہے اور کم و بیش یہی دولت عثمانیہ کے قیام سے اس کے نقطۂ کمال تک پہنچنے کا زمانہ بھی ہے۔ اسی زمانہ میں تصوف کی بے اعتدالیوں کو روکنے اور ان کے مسلک کو جائز حدود میں رکھنے کی قوتیں بھی حرکت میں آچکی تھیں۔ اول تو صوفی عرفانیات اور روایات ابن تیمیہ جیسے لوگوں کے ہاتھوں ہدف تنقید بن گئی تھیں۔ فروغ تصوف سے راسخ العقیدہ علماء کے قریبی اشتراک نے ان تحریکوں کو مہمیز کیا جو تصوف کی داخلی تطہیر کی خواہاں تھیں۔ یہ قوتیں چاہے وحدت الوجود کو مسترد کر رہی تھیں یا ہمہ اوستی فکر کو راسخ العقیدگی کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہ ساری مساعی بہرطور تصوف کو راسخ العقیدہ نصب العین

سے قریب تر لا رہی تھیں۔ مزید براں یہ رجحانات ان تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے جو عالم اسلام میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ رونما ہوئیں۔ گو ان کا ظہور علاقائی سطحوں پر ہوا' تاہم انہوں نے بارہویں اور تیرھویں صدی ہجری میں تصوف کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ تبدیلی اس عوامی مذہب پر ایک بڑی یلغار تھی جس نے عالم اسلام کے حاشیائی علاقوں میں عملاً اسلام کو بے دخل کر رکھا تھا۔ عوامی مذہب پر اس حملہ نے اصلاح مذہب کی ان طاقت ور تحریکوں کا روپ دھار لیا جو سارے عالم اسلام میں پھوٹ پڑی تھیں۔ بہرحال مختلف مسلم ممالک میں تصوف کا عوامی مذہب سے گہرا ربط تھا۔ اس لئے ان کا ان اصلاحی تحریکوں سے متاثر ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ جہاں ان تبدیلیوں سے پرانے صوفی سلسلوں کے معتقدات' رسوم اور روایات میں فرق پڑا' وہاں انیسویں صدی میں ایک نئے مطمح نظر کے ساتھ نئے صوفی سلسلوں کا قیام بھی عمل میں آیا۔ شمالی افریقہ میں سنوسیہ اور ہندوستان میں محمدیہ سلسلے اس کی مثالیں ہیں جو اپنی سوچ اور اپنے طریق عمل میں کٹر راسخ العقیدہ ہیں اور قدیم تصوف کے روایتی اہداف سے یکسر انحراف رکھتی ہیں۔

حواشی:

(۱) ڈی پنٹ (Depont) اور x- کوپلانی (Coppolani): Les confreries religieuses musulmans' الجیریا' (۱۸۹۰ء)' ص ۲۰۸

(۲) ایچ۔ اے۔ آر' گب (Gibb): محمڈن ازم' آکسفورڈ (۱۹۶۱ء)' ص ۱-۱۵۰

(۳) آر۔ اے۔ نکلسن: رومی' شاعر اور صوفی' (لندن ۱۹۵۰ء)' ص ۱۷۰

(۴) ڈی پنٹ (Depont) اور x- کوپلانی (Coppolani): Les confreries religieuses musulmans' الجیریا' (۱۸۹۰ء)' ص ۳۲۶

(۵) ایضاً' ص ۵۲۱' ۵۳۰

☆☆☆